© rasailojaraid.com

مظفر حسین

خودی اور آخرت

(۷)

بقائے دوام درحقیقت خود شعوری کی سطح پر انسانی زندگی کے ان امکانات سے عبارت ہے جو زندگی میں بالقوہ پائے جاتے ہیں اور جو بالفعل وجود میں آکر زندگی کو قائم و دائم رکھتے ہیں بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی "زندگی کوئی چیز ہے بالفعل ACTUALLY بھی اور بالقوہ POTENTIALLY بھی۔ بالفعل ہونے کی حیثیت سے اس کی تحقیق ہے اور بالقوہ ہونے کی حیثیت سے اس کے کچھ بن جانے کے امکانات کے ساتھ زندگی تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس حیثیت سے یہ عمل ہے، پیدائش ہے، تخلیق ہے ترقی ہے۔"

اے من و تو موجے از رود حیات — ہر نفس دیگر شود ایں کائنات
زندگانی انقلابے ہر دمے است — زانکہ او اندر سراغ عالمے است
تار و پود ہر وجود از رفت و بود — ایں ہمہ ذوق نمود از رفت و بود
جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر — ہر کجا پنہاں سفر پیدا حضر

اس انداز نظر سے دیکھا جائے تو زندگی نام ہے بالقوہ کو بالفعل وجود میں لاتے رہنے کے عمل کا۔ زندگی کو یوں ایک عمل متصور کر لیا جائے تو جن حقائق کو ہم عرف عام میں زندگی اور موت سے تعبیر کرتے ہیں وہ درحقیقت اس عمل کی بالقوہ اور بالفعل حالتیں ہیں۔ اصل زندگی عمل میں ہی مضمر ہے اس لئے قرآن پاک زندگی اور موت کو منازل تخلیق سے تعبیر کرتا ہے، عمل کو جوہر زندگی قرار دیتا ہے، اور حسن عمل کا منتہائے مقصود خودی کو ٹھہراتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (الملک)

(اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل)

(اگر تم اچھے عمل کرو گے تو اپنی جانوں کے لئے کرو گے اور اگر اعمال بد کرو گے تو اُس کا وبال بھی تمہاری اپنی جانوں پر ہوگا۔)

یعنی بقولِ اقبال سہ

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

عمل کی کسوٹی پر زندگی اور موت دو اعتباری اقدار RELATIVE VALUE ہیں جس میں معیار یہ ہے کہ بالفعل پر مطمئن اور قانع ہو کر رک جانا یا ٹھہر جانا موت ہے اور بالقوہ کی طرف حرکت کرتے رہنا زندگی۔ اسی کسوٹی پر جب ہم مدارج حیات کو پرکھتے ہیں تو وجود نامی ORGANIC BEING کے مقابلے میں وجود مادی PHYSICAL BEING مردہ ہے، وجودِ حیاتی BIOLOGICAL BEING کے مقابلے میں وجود نامی ORGANIC BEING مردہ ہے، وجودِ شعوری CONSCIOUS BEING کے مقابلے میں وجود حیاتی BIOLOGICAL BEING مردہ ہے۔ وجودِ خود شعوری SELF CONSCIOUS BEING کے مقابلے میں وجودِ شعوری CONSCIOUS BEING مردہ ہے اور وجودِ خُدا شعوری GOD CONSCIOUS BEING یعنی ایمان کے مقابلے میں وجود خود شعوری SELF CONSCIOUS BEING مردہ ہے۔ غرض یہ کہ بطنِ حیات میں جو اعلیٰ مدارج بالقوہ پائے جاتے ہیں ان کے مقابلے میں کسی کمتر درجۂ حیات پر کسی وقت رک جانا ارتقائے حیات کے اعتبار سے موت ہے اسی لئے قرآن پاک ایمان کی زندگی کو اعلیٰ تر زندگی سے تعبیر کرتا ہے اور ایمان سے عاری زندگی کو موت سے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۔

(اے ایمان والو جب تمہیں اللہ اور رسول کی طرف سے زندگی کی طرف پکارا جائے تو اس پکار کا جواب دو)

چنانچہ اس آیت کی تشریح میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم لکھتے ہیں:-

"اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی مومن کا کوئی ایسا مقام ہے جو اسے ایمان لانے کے بعد خدا اور رسول کی اطاعت سے ملتا ہے اسی مقام کو علامہ اقبالؒ خودی کی زندگی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعبیر کرتے ہیں۔

خدا شعوری کی وجہ سے انسان کی شخصیت میں ایک قلب ہئیت METAMORPHOSIS پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر انسانی شخصیت کو ایک بالکل نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح قالب جسم میں ایک نفسیاتی شخصیت پائی جاتی ہے بالکل اسی طرح نفسیاتی شخصیت کے قالب کو للّٰہیت کی وجہ سے ایک نئی نورانی شخصیت عطا کر دی جاتی ہے۔

مُردن و ہم زیستن اے نکتہ رس　　　این ہمہ از اعتبارات است و بس

اور انسانی سطح پر ایمان ہی شرطِ زندگی ہے۔

روح با حق زندہ و پائندہ است　　　ورنہ این را مردہ آں را زندہ است
آنکہ حیٌ لا یموت آمد حق است　　　زیستن با حق حیاتِ مطلق است
ہر کہ بے حق زیست جز مُردار نیست　　　گرچہ کس در ماتمِ اُو زار نیست

زندگی اگر ایک تغیر آفریں عمل ہے تو ہر وجود میں لحظہ بہ لحظہ موت و حیات کی کش مکش بھی جاری ہے جس میں موت نام ہے بالفعل حالت پر ہی رہ جانے کا یعنی کسی مقام یا درجے پر رُک جانے کا اور حیات نام ہے زندگی کی بالقوہ صلاحیتوں کو بروئے عمل لاتے رہنے کا۔ بطنِ حیات سے ممکناتِ زندگی کے سوتے کبھی ختم نہیں ہوتے، بشرطیکہ عمل کے ذریعے انہیں جاری رکھنے کی کوشش جاری رہے۔ اس اعتبار سے زندگی جاوداں ہے۔

ضمیرِ زندگانی جاودانی است　　　بچشمِ ظاہرش بینی زمانی است
بہ جانم رزمِ مرگ و زندگانی است　　　نگاہم بر حیاتِ جاودانی است

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　　جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

ممکناتِ زندگی کی کوئی حد نہیں ہے اور ان کو بروئے کار لاتے رہنے کا ہی دوسرا نام بقائے دوام ہے۔

زندگیٔ رہرواں در تگ و تاز است و بس
قافلۂ موج را جادہ و منزل کجاست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر زندگی اور موت بقا و ثبات کی منازل ہیں تو جو چیز اقبال کے نزدیک بقا یا ثبات کہلاتی ہے وہ نواہی کے الفاظ ہیں" ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" جس کے لئے آپ نے "گردشِ پیہم" "سوختنِ ناتمام" "کاوشِ ناتمام" "پروازِ مدام" "بپایاں نارسیدن" اور فروغِ جاوداں جیسی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جام زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوام زندگی

تو شناسی ہنوز، شوق بمیرد زوصل — چیست حیاتِ دوام، سوختنِ ناتمام

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اے مسافر جاں بمیرد از مقام — زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

بپایاں نارسیدن زندگانی است — سفر مارا حیاتِ جاودانی است

زندگی کی قوت پنہاں کو کردے آشکار — تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

عمل ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد کے حوالے سے ہی متصور ہوتا ہے اس لئے حیات کا استدام لامتناہی مقصود سے عمل کا رشتہ جوڑ دینے سے ہی ممکن ہے۔ اگر لامتناہی کی طلب زندہ رہے گی تو انسان بھی زندہ رہے گا اور راستے کی رکاوٹیں اس کے لئے آگے بڑھنے کی شرائط قرار پائیں گی۔

مسافر جاوداں زی جاوداں میر — جہانے را کہ پیش آید فراگیر

بہ بحر ستش گم شدن انجام ما نیست — اگر او را تو درگیری فنا نیست

علامہ اقبال بقائے دوام PERSONAL IMMORTALITY کے سلسلے میں حیات کی جس لامتناہیت کے قائل ہیں اس سے افزونی و توسیع اور شدت وحدت INTENSITY مراد ہے نہ کہ امتداد و پہنائی EXTENSITY بلکہ خود ذاتِ باری تعالیٰ کی لامتناہیت کے بارے میں علامہ اقبال جو تصور رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ

" ذات الہیہ کی لامتناہیت کا قیاس مکانی لامتناہیت پر نہیں کرنا چاہیئے۔ روحانی مراتب کی تعین میں وسعت اور پہنائی ایک بے حقیقت شے ہے۔ لامتناہیت خواہ مکانی ہو یا زمانی اس کو مطلق ٹھہرانا غلط ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ذات الٰہیہ کے ماوراء اور اس کی تخلیقی فعالیت کے علاوہ زماں و مکاں کا وجود ہی نہیں کہ ہم اس کو دوسری ذات کی نسبت الگ تھلگ ٹھہرائیں۔ لہٰذا ذات حقیقی نہ تو مکانی لامتناہیت کے معنوں میں لامتناہی ہے نہ ہم انسانوں کی طرح متناہی جو مکاناً محدود اور جسماً دوسرے انسانوں سے جدا ہیں۔

وہ لامتناہی تو ان معنوں میں ہے کہ اس کی تخلیقی فعالیت کے ممکنات جو اس کی ذات میں مضمر ہیں لامحدود ہیں اور یہ کائنات جیسا کہ ہمیں اس کا علم ہے ان کا جزوی مظہر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ذات الٰہیہ کی لامتناہیت اس کی افزونی اور توسیع میں ہے امتداد اور پہنائی میں نہیں"

علامہ اقبال چونکہ جنت اور دوزخ کو مقامات نہیں بلکہ خودی کے احوال و کوائف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے انسان کے لئے حیاتِ جاوداں کا جو تصور آپ نے دیا ہے وہ بھی خودی کی افزونی و توسیع اور شدّت وحدت پر مبنی ہے[1] جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگر خودی کا تعلق عالم خارجی کے بجائے لامتناہی خودی (یعنی ذاتِ باری تعالیٰ) سے ہو جائے تو اس کی باطن کی آرزو ہی اسے معراج و کمال کے زینے در زینے (لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۞) طے کروا دے گی اور عالم خارجی (خواہ وہ دنیا ہو یا آخرت) کی تمام رکاوٹیں اس کے لئے محرک INCENTIVE قرار پائیں گی۔

بقائے دوام کے بارے میں علامہ اقبال کا یہ نظریہ خالصتاً شعوری مذہبی RELIGION کا پیدا کردہ ہے۔ نہ کہ شعور نظری کا عقلیت RATIONALISM یا حسیّت EMPERICISM کے تقاضوں کا ماحصل جو فقط علم تک محدود ہے۔ یعنی آخرت کی زندگی اگر ہے تو کیا ہے اور کیسی ہے؟ اور بالآخر اگر اس کا کچھ علم حاصل ہو بھی جائے تو اس سے عمل پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ

---

[1] شبے زار نالید ابرِ بہار — کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت — خطا کردہ خندۂ یک دم است

ز انکہ در عرضِ حیات آمد ثبات — از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش — یک دم شیری بہ از صد سال میش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن آخرت کا اطلاق BEARING اس دنیاوی زندگی پر لانا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر آخرت کی زندگی کے بارے میں ہمیں اس قسم کا علم تفصیل کے ساتھ بھی حاصل ہو جائے کہ موجودہ بحر احمر ہی کو حوض کوثر میں تبدیل کر دیا جائے[1] یا یہ کہ جہنم کا ایندھن پتھر کا کوئلہ یا گندھک کا تو اس سے شعور حسی کے تقاضے تو ممکن ہے کہ کسی حد تک تو پورے ہو جائیں لیکن اس میں اس کی ضمانت ہرگز نہیں کہ اس قسم کی علمی تسلی انسان کے لئے کسی عمل کی تحریک بھی پیدا کر سکے۔ جب کہ قرآن کو اس بات پر اصرار ہے کہ آخرت پر ایمان لانے سے انسان کی موجودہ زندگی بدل جانی چاہیے۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا[2] (مزمل)

(تم کیونکر تقویٰ اختیار کر سکتے ہو اگر اس دن کا انکار کر دو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)

دوسرے لفظوں میں ہمیں اس زندگی میں آخرت کا ایسا ایمان درکار ہے جو اس زندگی میں انسان کو تقویٰ کی صفت سے مزین کر سکے جو ہمارے شعور عملی کا تقاضا ہے ورنہ جہاں تک قرآن میں آخرت کے حقائق کے بیان کا تعلق ہے وہ انسان کے علمی شعور کی حسی یا عقلی رعایتوں سے بیان نہیں ہوئے نہ ہی مقامات واقعی کے طور پر جن کو ہم اپنی موجودہ ذہنی سطح پر سمجھنے کی سرے سے ہی استعداد نہیں رکھتے۔ علامہ اقبال آخرت کی زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں:

زندگی کے بے شمار مدارج ہیں۔ اس ضمن میں بہت سے امور عقل انسانی سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق بصیرت اور ایمان اور ذرائع سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ذرائع کا تعلق فلسفہ سے نہیں"

"یوں بھی شعور مذہبی کا تقاضا علم اور فلسفہ کے تقاضوں سے یکسر مختلف ہے۔ شعور مذہبی کا مسئلہ درحقیقت انسانی ارادہ کو توانا بنانے اور عمل کو انگیز کرنے کا مسئلہ ہے۔ بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی:

"شعور مذہبی وہ امنگ ہے جو انسان میں حقیقت حقہ کے بالمقابل پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ حصول کمالات میں سر نہ ہو سکنے والی مشکلات اور مزاحمتوں سے دوچار ہے۔ ایک طرف تو وہ خود ہے اسے حقیقت سے ہم آہنگ ہونے کی طلب ہے اخلاقی کمال

---

[1] تفہیم القرآن مولانا مودودی جلد ششم صـ ۴۹۴

[2] تفہیم القرآن مولانا مودودی جلد ششم صـ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مسرت و جمال کے حصول کی خواہش ہے اور دوسری طرف کائنات کہ اپنی تمام تر وسعتوں اور فراخیوں کے باوجود تیرہ و تار، درندہ صفت، معصیت سے لبریز اور قبیح صورت مناظر ہیں جو اخلاقی اور روحانی تمناؤں کے پورا ہونے میں سدِ راہ ہیں۔ اس صورتِ حال سے دوچار ہو کر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بالکل بے یار و مددگار اور بے بس و بیکس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی فوز و فلاح کے لئے کوئی ایسی ذات ہو جو اس کی مدد کرنے کی قدرت، طاقت اور ارادہ رکھتی ہو۔

یہاں نہایت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسا کوئی وجود ہے؟ عقل و حواس اور وہم و قیاس کی مساعی تو ہمیں اس تک پہنچا نہیں سکیں۔ شعورِ مذہبی کا دعویٰ ہے کہ ایسا وجود ضرور ہے اور اگرچہ ہم اسے خود اپنی استعداد اور سعی سے نہیں پا سکتے لیکن وہ خود ہماری رہنمائی اپنی جانب کرنے میں سبقت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ شعورِ مذہبی ایسی ذات کے وجود کا اثبات کرتا ہے تاکہ وہی اس کی فطری احتیاجات کو پورا کرنے میں اس کی مدد کر سکے اور وہی اس کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر سکے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی لامتناہی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے خود اپنی ذات اور عالم کی فطرت سے مایوس ہو کر ایک ایسی ذات کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے تعلق قائم کر کے ہی وہ اپنی امنگوں کو پورا کر سکنے اور اپنی مراد کو پہنچنے کے قابل بن سکتا ہے ظاہر ہے شعورِ مذہبی کی رو سے انسانی شخصیت کا جوہر ارادہ ہے نہ کہ عقل و منطق۔ لہٰذا اس ارادے کا کمال اگر اپنے مقصود کو پانے میں مضمر ہے تو اس کے لئے آخرت لابدی ہے اور حصولِ کمال کے لئے حیّ و قیوم ذات سے تعلق ناگزیر۔ بقائے دوام کی یہی اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے جینے کی آرزو کا نفسیاتی تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے اور جزا و سزا کا اخلاقی تقاضا بھی۔ چنانچہ آخرت کی زندگی فقط ایمان ہی کا تقاضا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال کے نزدیک بقائے دوام کی شرط ایمان و یقین ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نصیبِ اوست مرگے ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ہو زیست

ایمان نام ہے اُس خاص قسم کے خیال کا جس کی ابتدا ارادے سے ہوتی ہے۔ محض خیال ایمان نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان نتیجۂ فکر و خیال نہیں ہوتا اسی لئے ایمان ایک اختیاری چیز ہے۔ خیال میں ارادے کا عنصر غالب اور قوی ہو جائے تو اس کا نام یقین ہے اور اس کی منزل عین الیقین اور حق الیقین ہیں۔ یقین سے لازماً عمل پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم ایمان اور عمل صالح کو لازم و ملزوم کے طور پر ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ عمل صالح کا نتیجہ تخلیق ہے جس میں نیست سے ہست کرنے کی قدرت ہے چنانچہ ایک مردِ خدا کے نقشِ تخلیق میں بھی رنگِ ثباتِ دوام پایا جاتا ہے۔"

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

الٰہیات اسلامیہ میں بقائے دوام کے مبنی بر استحقاق[1] RIGHT ہونے کے برعکس قابلِ تحصیل ACHIEVEMENT ہونے کے دلائل اور بھی ہیں جن کو علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے مثلاً مذہبی فکر کا ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ یہ کائنات قائم بالذات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ چنانچہ ہر وجود جو اس کائنات میں موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قول "کُن" کے نتیجے کے طور پر عالمِ نیست سے عالمِ ہست میں آیا ہے اس لئے ہر ہستی در حقیقت حکمِ باری تعالیٰ کی تکمیل و تعمیل سے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ میری ہستی اللہ تعالیٰ کے حکم "ہو جا" کی وجہ سے ہے اس لئے زندگی نام ہی اطاعت کا ہے یا دوسرے لفظوں میں فرض کی بجا آوری کا۔ تصورِ وجود سے پہلے تصورِ تخلیق کا ذہن میں آنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ "ہست" "بُود" بایَد مقدم ہے اس لئے تسلسلِ حیات تسلسلِ فرائض سے ہی سے قائم رکھا جا سکتا ہے کیونکہ تخلیق کے عمل میں اگر حرف "کُن" کی کارفرمائی مسلّم ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اخلاقی دائرے میں اس حرف "کُن" کو حکم یا وُحی پیر

---

[1] ؎ زندگی جہد است و استحقاق نیست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیاس کر کے زندگی کو تسلسلِ فرائض تسلیم نہ جائے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات　　جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے　　آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگہ ہے

اس حقیقت کی مزید وضاحت زمان و مکاں کے حوالے سے یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اگر وجود عبارت ہے دورانِ زمان میں قیام و استمرار سے جسے مذہب کی زبان میں عملِ "فیکون" کا نام دیا جا سکتا ہے اور جو "کُن" کی بنیاد پر ہی قائم ہے اور "کن" سے مراد تمثال یا مخفی نقشِ ہستی DIVINE IMAGE ہے جس کی طرف بڑھنے والا ہر قدم اپنے اندر حیاتِ جاوداں کی ضمانت رکھتا ہے لہذا حیاتِ جاوداں کا راز فقط یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا رخ تمثالِ ربّی کی طرف رہے ع

اگر اُو را تو در گیری فنا نیست

اس لئے زندگی کو موت سے ہمکنار کرنے والے زماں پر غالب آنے کی یہی تدبیر ہے کہ تمثالِ ربی کی طرف پیش قدمی جاری رہے ؎

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے

جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

حاصلِ کلام یہ ہے کہ علامہ اقبال نے شخصی بقائے دوام کی لامتناہیت کو مکانی اور زمانی سلاسل سے منقطع کر کے اسے خودی کے اندرونی عمق، توسّع اور شدت INTENSITY یعنی زندگی کے بالقوہ امکانات سے وابستہ کرنے میں ایک ایسی فوق العادت ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا ہے جس میں کوئی دوسرا فلسفی یا متکلم اسلام ان کا ہمسر و عدیل نہیں۔ اس ضمن میں آپ نے خودی کے جس دروُنی زمان و مکاں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دورِ حاضرہ کے بعض مفکرین کے لئے بھی ایک اچھوتا اور نادر موضوعِ خیال [1] ہے۔ مثال کے طور پر ابراہم جوشوا ہیشل لکھتا ہے:

تمام ٹھوس موجودات کی طرح انسان خارجی مکان میں ایک مقام رکھتا ہے تاہم دوسرے موجودات کے برعکس انسان کا وجودِ حقیقی ایک اندرونی مکان INNER SPACE میں

---

[1] دورِ حاضر کے بہت سے مفکرین نے دروُنی زمان و مکاں تسلیم ہے جن کی تفصیلی ذکر کی یہاں گنجائش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی بسر کرتا ہے۔ جغرافیہ بے شک اس کے طبعی مقام کو متعین کرتا ہے تاہم اس کا اصلی شخصی مقام اُس کے اندرونی خیالات اور خاص طور پر اس کے شعورِ خودی پر مبنی ہے۔"

بقائے دوام کے متعلق علامّہ اقبال کے نظریات کسی فلسفی یا مفکر سے مستعار نہیں ہیں بلکہ اسلامی افکار کے گہرے مطالعہ کا ماحصل ہیں کیونکہ خود قرآن حکیم کے نزدیک بھی آخرت ایک نفسی حقیقت ہے۔

یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝ اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ (الروم)

(یہ لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کا علم رکھتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں کیا انہوں نے اپنے نفس میں غور نہیں کیا؟)

جنت کی ماہیت کے بارے میں ایک جگہ نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ باتیں تو محض تمثیلاً بیان کی گئی ہیں۔

مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلۡكَ عُقۡبَى الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ۖ وَّعُقۡبَى الۡكٰفِرِيۡنَ النَّارُ ۝ (رعد)

"وہ جنت جس کا وعدہ متّقیوں سے کیا گیا ہے۔ اُس کی مثال یوں ہے کہ اُس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اس کے پھل اور سائے ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو متّقی ہیں اور کافروں کا انجام دوزخ ہے)

اور دوزخ کے بارے میں ایک جگہ یہ وضاحت کی گئی ہے

وَمَا هِىَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡبَشَرِ ۝ كَلَّا وَالۡقَمَرِ ۝ وَالَّيۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ۝ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ۝ اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ ۝ نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ ۝ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّتَقَدَّمَ اَوۡ يَتَاَخَّرَ ۝ (مدثر)

اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا اور کسی غرض کے لئے نہیں کیا گیا کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔ ہرگز نہیں۔ قسم ہے چاند کی اور رات کی جو پلٹتی ہے اور صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے۔ یہ دوزخ بڑی چیزوں میں سے ایک ہے تم میں سے ہر شخص کے لئے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے)

ان قرآنی اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شخصی بقائے دوام درحقیقت ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

داخلی عمل ہے جو تشریح ہے رازِ کن فیکون کی۔ یکون چونکہ مضارع کا صیغہ ہے اس لئے اس میں حال اور مستقبل دونوں شامل ہیں۔ یہ کوئی طے شدہ امر ACCOMPLISHED FACT نہیں اور اسی وجہ سے اس میں لامتناہی امکانات INFINITE POSSIBILITIES مضمر ہیں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اسی نظریہ تخلیق کی رو سے انسان بھی کوئی تکمیل یافتہ شے FINISHED PRODUCT نہیں بلکہ وہ مسلسل تخلیق کے دائرہ عمل میں ہے۔ زندگی کے لامتناہی امکانات کے ظہور پذیر ہونے کو قرآن "اجرٌ غیر ممنون" کا نام دیتا ہے اور انسان اس عملِ تخلیق میں مصروف رہتے ہوئے بقائے دوام حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست　　پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

بقیہ: نقد و نظر

کہ علامہ اقبال کے افکار کو ۱۹۳۸ء کے بعد کے انکشافات کے حوالے سے پڑھنا چاہیئے۔ ان کے نزدیک گذشتہ چالیس، پچاس سال اسلامی عقیدوں کی فتح کے سال تھے جب کہ موجودہ دَور کی نسل میں تشکیک کے جراثیم پھیل رہے ہیں۔ علامہ مرحوم کی نگاہ دوربین ان تمام مسائل کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس لئے انہوں نے ان غلط رجحانات سے نبرد آزمائی کی ایسی راہیں سجھائیں جو آج بھی ان کے دعویٰ "من نوائے شاعر فرداستم" کی صداقت پر گواہ ہیں اور اس اعتبار سے فکرِ اقبال کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

جناب محمد یوسف صاحب نے شعائر اللہ، حرمات اللہ اور قرآن کی تعظیمی قسمیں، کے مضمون میں مسلمانوں کے تاریخی آثار کو محفوظ رکھنے کی طرف متوجہ فرمایا ہے کیونکہ قومیں اپنی تاریخ کو محفوظ رکھ کر ہی قومی احساس تشخص کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

"خودی اور آخرت" کی اس قسط میں مظفر حسین صاحب نے علامہ اقبال کے نظریہ بقائے دوام کی مزید تشریح و توضیح کی ہے اور ذوقِ حیات کی شدت میں لامتناہیت کی جہت نمائی کی ہے جس سے علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔

© rasailojaraid.com